علم حدیث کے بارہ میں

مستشرقین اور مغربیت زدہ علماء کے اعتراضات

ایک اجمالی تنقیدی جائزہ

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی کے بین الاقوامی سیمینار منعقدہ ۲۱، ۲۲، ۲۳

فروری سنہ ۸۲ء میں پڑھے جانے والے عربی مقالہ کا اردو ترجمہ

از

ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن

امّا بعد! اللہ تعالےٰ کے جو بے پایاں احسانات اس ناچیز پر ہیں اور جن کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہوں، ان میں اس کا خصوصی فضل و کرم یہی رہا ہے کہ ہمارے استاد و شیخ و مربی حضرت اقدس شیخ الحدیث صاحب متع اللہ المسلمین بفیوضہم کی ہمیشہ شفقت و کرم کی خصوصی نظر رہی، اسی بناء پر سنن ابی داود کی عظیم الشان شرح بذل المجہود کے حواشی کی تصحیح و ترتیب و تحقیق اور اس کی طباعت کا اس ناچیز کو موقع عطا فرمایا

منت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمی کنی ؛ منت ازو شناس کہ خدمت بداشت

کئی سال پہلے راقم حضرت اقدس کی خدمت میں سہارنپور دو برس قیام کیلئے گیا تو انھوں نے دوسرے سال اس کی طباعت کے لیے قاہرہ بھیجا، یہ ناچیز اپنے رفقاء مولانا عبد الحفیظ مکی اور مولانا عبد الرحیم متالا کے ساتھ ۲۶ جنوری ۱۹۷۲ء کو قاہرہ پہونچا۔ الحمد للہ حضرت اقدس کی عرصہ کی تمنا پوری ہوئی، اور بذل المجہود

---

۱ اس رسالہ کا مقدمہ لکھ چکا تھا کہ اچانک حضرت اقدس سلطان العارفین شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کے سانحۂ ارتحال کی خبر بجلی بن کر گری کہ حضرت یکم شعبان المعظم ۱۴۰۲ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۹۸۲ء کو اس دار فانی سے مدینہ منورہ میں۔ (بقیہ ص ۲ پر)

کی طباعت مکمل ہوئی یہ کتاب بیس جلدوں میں ہے) نیز اوجز المسالک شرح موطا امام مالک کی دو جلدیں بھی میری موجودگی میں پوری ہوئیں، اور بقیہ ۱۳ جلدیں بعد میں مکمل ہو سکیں،

گو ان دونوں کتابوں کی طباعت کی ذمہ داری مکتبہ امدادیہ مکہ مکرمہ نے قبول کرلی تھی مگر ابوظبی کے چیف جسٹس شیخ احمد بن عبدالعزیز المبارک نے حکومت ابوظبی کی طرف سے بھی تعاون کیا تھا۔ یہ حضرت اقدس شیخ الحدیث صاحب مدفیوضہم کے معتقد اور ان کی کتابوں کے گرویدہ ہیں اور انھیں صدر مملکت شیخ زاید بن سلطان آل نہیان کے یہاں بڑا رسوخ حاصل ہے، راقم کا چیف جسٹس صاحب سے قاہرہ کے قیام کے زمانہ میں ان دونوں کتابوں کی وجہ سے جب تعارف ہوا تو انھوں نے ابوظبی میں ملازمت کی مجھ سے پیش کش کی تھی، مگر میں وہاں کچھ تاخیر سے پہونچا اور ۱۳ جون ۱۹۷۵ء سے ملازم ہوا۔ اس کی اطلاع جب حضرت اقدس کو مدینہ منورہ دی تو اس پر خوشی کا اظہار فرمایا اور تحریر فرمایا کہ میں دعاگو ہوں کہ وہاں کے قیام سے حدیث پاک کی نشر واشاعت کا

(بقیہ حاشیہ صا) رحلت فرماگئے، اور ان کی جنۃ البقیع میں آرام فرمانے کی تمنا اللہ تعالیٰ نے پوری فرمادی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، آج اس حادثہ کبریٰ پر خدام ومتعلقین اور سارا عالم غمزدہ ہے، ؎

نہ سمجھے تھے کہ اس جان جہاں سے یوں جدا ہوں گے۔
یہ سنتے گو چلے آتے تھے اک دن جان ہے جانی

اس ناچیز نے حضرت والا کی خدمت میں رمضان المبارک میں حاضری کی تیاری کرلی تھی، اور ان کی کتاب "الکوکب الدری" کو متن حدیث کے ساتھ ابوظبی حکومت کی طرف سے طباعت کی منظوری کی اطلاع بھی کرچکا تھا جس پر حضرت اقدس نے بیحد خوشی ومسرت کا اظہار فرمایا تھا، مگر تقدیر الٰہی کے سامنے چارہ کار نہیں، اللہ تعالیٰ حضرت اقدس کے درجات بلند فرمائے، اور ان کے فیض کو جاری رکھے آمین

اللہ تعالیٰ تم سے کام لے، یہ ان کی دعاؤں کی برکت ہے کہ یہاں پر کام کا میدان نکلتا گیا سرکاری پوسٹ میری (قاضی) جسٹس کی ہے، مگر میرے ذوق کے مطابق چیف جسٹس صاحب نے مجھے علمی کاموں کے لیے خاص کر دیا ہے۔ چنانچہ تین سال سے یہاں کی عین یونیورسٹی میں حدیث شریف پڑھا رہا ہوں، ریڈیو وٹیلیویژن پر بولنے اور تقریریں کرنے کے علاوہ اخبار ورسائل میں لکھنے کا موقع بھی ملتا رہتا ہے، نجی طور پر تصنیف وتالیف کے کام کا بھی سلسلہ جاری ہے، ان باتوں کا یہ ناچیز تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، مگر یہ سب حضرت شیخ کی دعا وتوجہ کی برکت ہے، اس کی تفصیلات انشاءاللہ میری دوسری کتاب میں تحریر ہوں گی، جو حضرت شیخ الحدیث کے حالات پر مشتمل ہے۔

ع کبھی فرصت سے سن لینا عجب ہے داستاں میری

ابوظبی کے قیام میں مجھے مختلف اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کا موقع بھی ملتا رہتا ہے ان میں کبھی تو چیف جسٹس کے نمائندہ کی حیثیت سے اور کبھی مستقل اور براہ راست خود مدعو ہونے کی بنا پر حاضر ہوتا ہوں، ہندوستان میں اب تک مجھے مندرجہ ذیل چار بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا ہے۔

۱۔ ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ تعلیمی جشن منعقدہ نومبر ۱۹۷۵ء
۲۔ دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۸۰ء
۳۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مذاکرہ ادبیات اسلامی منعقدہ اپریل ۱۹۸۱ء
۴۔ اور دارالمصنفین اعظم گڈھ کا بین الاقوامی سمینار جو ۲۳ فروری ۱۹۸۲ء کو اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر منعقد ہوا تھا، میں چیف جسٹس صاحب کا پیام اردو وعربی میں پڑھکر سنانے کا موقع ملا تھا، اعظمگڈھ میرا وطن ہے اور دارالمصنفین اور اسکے اکابر سے ہمیشہ تعلق رہا ہے اسلیے جب اسکی طرف سے اسکے ناظم جناب سید صباح الدین صاحب نے دعوت نامہ بھیجا جسمیں مقالہ کی فرمائش بھی کی گئی تھی تو اسکی مناسبت سے میں نے "السنۃ مع المستشرقین والمستغربین" کے عنوان سے یہ مقالہ لکھ کر اس سمینار میں پیش کیا تھا اسکا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی نے ازراہ عنایت کردیا ہے جو اس مختصر رسالہ میں شائع کیا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ اسکو نافع اور مفید بنائے وما ذلک علی اللہ بعزیز

تقی الدین ندوی مظاہری ۲۰ر مئی ۸۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بلاشبہ اس حقیقت پر امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ اسلامی قانون کے بنیادی چار مآخذ میں قرآن کے بعد حدیث و سنت کو دوسرا مقام حاصل ہے، لیکن بایں ہمہ مستشرقین و منکرین حدیث اور فرقہ ضالہ نے ہمیشہ اس مسلمہ حقیقت کے خلاف حدیث کو اس کے بلند مقام سے گرانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کے پس پشت اسلامی معاشرہ کے پورے ڈھانچہ کو تباہ کرنا اور اس میں انتشار اور انارگی پیدا کرنے کا جذبہ کار فرما رہا ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے عہد روشن (جسے ہم عہد بنی عباس کا نام بھی دے سکتے ہیں) میں زنادقہ وغیرہ دشمنان اسلام نے اسلام کے خلاف جس طرح کی منظم سازشیں کیں اسی طرح مستشرقین اور جدید مغربی تہذیب کے پروردہ ان کے ہمنوا آج بھی سرگرم عمل ہیں۔ اس لئے کہ آفتاب اسلام کی درخشاں کرنوں سے اعدائے اسلام کی نگاہیں جب خیرہ ہوتی ہیں تو وہ فرط غیظ و غضب سے دیوانہ ہو کر قرآن، حدیث، اجتہاد اور اسلامی تاریخ و تمدن کا روشن چہرہ مسخ کرنے کے لئے کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ نور خدا ہمیشہ کفر کی حرکات پر خندہ زن رہا ہے اور قانون فطرت کے مطابق حق و باطل کے معرکوں

میں فتح ہمیشہ حق ہی کا مقدر رہی ہے۔

اس افسوس ناک حقیقت کا ذکر کرنا ناگزیر ہے کہ ہمارے بعض مسلمان تعلیم یافتہ حضرات بھی مستشرقین کی نام نہاد علمی تحقیقات اور دسیسہ کاریوں کے فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں، اس کا سبب یا تو اسلام کے سرچشمۂ صافی سے ان کی عدم واقفیت ہے یا پھر ان کی فکری کجروی جسے انھوں نے مستشرق اہل قلم کی آڑ میں پیش کیا ہے۔

دراصل مستشرقین کو مغربی حکومتوں نے تحقیق و تالیف کے لئے یکسو اور فارغ کر دیا ہے اور انھیں ہر طرح کی سہولیات نیز تمام ممکن الحصول مراجع و مصادر فراہم کئے ہیں، ہر مستشرق کسی خاص فن کو اپنی خصوصی جولانگاہ قرار دے کر تا حیات اس میں مشغول و منہمک رہتا ہے۔ اس لیے مستشرقین جو کچھ بھی لکھتے ہیں اسے علمی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اور وہ اپنی تحقیقات کو بکثرت مطبوعہ اور مخطوطہ مراجع کے حوالوں سے مزین کرتے ہیں۔ اسی باعث ان کی علمی تحقیقات مغربی تہذیب کے دلدادہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے وجہ کشش بن جاتی ہیں۔ اور وہ اس کے مکر و فریب میں اکثر مستشرقین کے فنی کمالات اور علمی خلوص و دیانت پر صدائے تحسین و آفریں بلند کرنے لگتے ہیں۔ بالآخر وہ اس سے متاثر ہو کر اپنی علمی تالیفات میں ان گمراہ کن آراء و نظریات کو بعینہ نقل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اسلامی اور عربی فکر کے متعدد ممتاز مفکرین نے اپنے ملکوں سے باہر جا کر مستشرقین سے استفادہ کیا یا انھیں اپنے علمی و تعلیمی اداروں میں مدعو کر کے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مستشرقین کی بکثرت تالیفات کے ترجموں سے اسلامی کتب خانے بھرے پڑے ہیں۔

علوم اسلامیہ کے سلسلہ میں مستشرقین نے جو فکری کارنامے انجام دیئے ہیں، ان پر سلبی اور ایجابی دونوں طرح کی چھاپ ملتی ہے۔ اول الذکر نوعیت کے کارنا

میں انتہا پسندانہ دعوتی رنگ غالب ہے۔ اور اسی سے بیمار نفوس میں اسلام اور اس کی تعلیمات کے خلاف عداوت کے جذبات کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ ثانی الذکر نوعیت کے علمی کام معروضی انداز کے حامل اور بحث و تحقیق تک محدود رہتے ہیں۔

چنانچہ ہمارے علمائے اسلام کا معروف موقف اس سلسلہ میں یہ ہے کہ جو امور اسلام کے عین مطابق ہوں انھیں بعینہ برقرار رکھا جائے۔ اور ان کی قدردانی کی جائے اور جو چیزیں مسلمہ اسلامی حقائق کے خلاف ہیں۔ ان کی غلطیوں کی نشاندہی اور نتائج پر متنبہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جب ہم علم حدیث کی شہرۂ آفاق تصنیف "مفتاح کنوز السنہ" پر احمد محمود شاکر کا مقدمہ پڑھتے ہیں تو اس میں معروف مستشرق (فنسنک) کے اس اہم علمی کارنامے کے لیے اس کی غیر معمولی محنت و جد و جہد کا پورا اعتراف ملتا ہے۔ مگر عین اسی مستشرق کے بارے میں "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" میں احمد محمود شاکر اپنے تعارفی مقالہ میں جگہ جگہ اس کا تعقب، تصحیح اور حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ملتے ہیں لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ مسلم طبقہ نے اپنے مستشرق اساتذہ کے آراء و افکار کو بغیر کسی تحقیق و تنقیح کے نہ صرف قبول کر لیا ہے بلکہ علمی تحقیق کے نام پر اپنے زبان و قلم سے ان کی نشر و اشاعت بہت پُر جوش انداز میں کی ہے۔

ڈاکٹر احمد امین پر نقد | اس جماعت کے سرخیل ڈاکٹر احمد امین ہیں جو "فجر الاسلام" "ضحی الاسلام" اور "ظہر الاسلام" جیسی مشہور کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے اپنی تالیف "فجر الاسلام" میں حدیث و سنت کے موضوع پر بھی حق و باطل کی آمیزش کے ساتھ خیال آرائی کی ہے اور اپنے مستشرق اساتذہ کے نقوش قدم کی اتباع کرتے ہوئے نہ صرف اسلام کے مسلم حقائق کی تحریف بلکہ صحابہ کرامؓ و تابعین عظام کی مقدس جماعت کے ساتھ ظلم و زیادتی کی کوشش بھی کی ہے۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:

"علمائے جرح و تعدیل نے کچھ قواعد وضع کیے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مگر حق بات یہ ہے کہ انھوں نے نقد متن کی بہ نسبت نقد اسناد کے ساتھ زیادہ اعتناء کیا ہے۔ چنانچہ اس نوعیت کا نقد بہت کم ملتا ہے کہ مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو قول منسوب ہے وہ ان حالات و ظروف سے مطابقت نہیں رکھتا ہے جن میں وہ کہا گیا ہے، یا مسلم تاریخی واقعات اس کے متناقض ہیں، یا عبارت حدیث دراصل ایک طرح کی فلسفیانہ تعبیر کلام ہے یا یہ کہ حدیث اپنے شرائط و قیود کے ساتھ متون فقہ سے زیادہ مشابہ ہے چنانچہ محدثین نے اسماء الرجال کی جرح و تعدیل میں جو غیر معمولی کاوش و محنت کی ہے اس کے مقابلہ میں مذکورہ بالا امور کی طرف عشر عشیر بھی توجہ نہیں کی ہے۔ یہاں تک کہ امام بخاریؒ اپنی تمام جلالت مرتبت اور دقت نظری کے باوصف ایسی احادیث درج کرتے ہیں جن کے غیر صحیح ہونے پر حقائق روزگار اور تجربات و مشاہدات دلالت کرتے ہیں اس کا باعث یہ ہے کہ امام بخاریؒ کی ساری توجہ کا محور نقد رجال رہا ہے۔ مثلاً درج ذیل دو حدیثیں۔[1]

۱- لا یبقی علی ظہر الارض بعد مائۃ سنۃ نفس منفوسۃ	سو سال کے بعد روئے زمین پر کوئی شخص زندہ نہ رہے گا۔
۲- من اصطبح کل یوم سبع مرات من عجوۃ لم یضرہ سم و لا سحر ذلک الیوم الی اللیل۔[1]	جو شخص روزانہ سات عدد عجوہ کھجور کا ناشتہ کریگا۔ اسے اس دن رات تک کوئی زہر یا سحر نقصان نہیں پہونچا سکتا،

[1] فجر الاسلام ص ۲۱۶-۲۱۸

ڈاکٹر احمد امین کے مذکورہ بالا ارشادات کا ماحصل دو امور ہیں۔

۱۔ محدثین نے نقدِ حدیث کے جو قواعد مقرر کئے ہیں۔ ان کا نقد۔

۲۔ احمد امین کے وضع کردہ قواعد نقد حدیث کے مطابق صحیح بخاری کی مذکورہ دو حدیثوں پر نقد۔

استاذ مصطفی سباعی نے لکھا ہے کہ احمد امین دراصل انکار حدیث کے سلسلہ میں مستشرقین کی معروف فکر کے ایک بڑے داعی اور علمبردار تھے۔ اس لئے اگر انھوں نے اپنے مذکورۃ الصدر خیالات میں مسلّمہ تاریخی حقائق سے انکار کیا ہے تو یہ کوئی محل تعجب و حیرت نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علمائے اسلام نے حدیث و سنت کی حفاظت اور اسے تحریف و تزییف کی ہر کوشش سے پاک و صاف رکھنے کیلئے جو جانکاہ کاوشیں اور غیر معمولی جد وجہد کی ہے۔ اس کی نظیر پوری علمی تاریخ میں مفقود ہے۔ بلاشبہ ماہرین جرح و تعدیل نے نقد متن اور نقد اسناد دونوں کے ساتھ یکساں اعتناء کیا ہے۔ چنانچہ مصطلحات حدیث میں ہمارے علماء نے جو تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی منکشف ہو جاتی ہے کہ سند حدیث کے ساتھ متن حدیث بھی علمائے فن کی فکر و کاوش کا خصوصی جولانگاہ رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم مصطلح الحدیث صرف اسناد کے مباحث پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ متن حدیث کے مسائل کو بھی شامل ہے، ظاہر بیں نظر یہ خیال کرتی ہے کہ نقادِ حدیث نے متن حدیث سے زیادہ اسناد پر خصوصی توجہ منعطف کی ہے۔ لیکن دراصل یہ صرف ایک واہمہ ہے جو دقتِ نظری اور تحقیق علمی کی کسوٹی پر آنے کے بعد محض ایک خواب پریشاں رہ جاتا ہے۔ بلاشبہ ماہرین فن محدثین عظام کی علمی بحثیں حدیث کے متن و اسناد دونوں کے محور پر گردش کرتی ہیں۔ انھوں نے ضعیف سند کو صحیح سے اور خبر موضوع کو غیر موضوع سے متمایز کرنے کے لیے کچھ علامات کا

تعین کیا ہے، چنانچہ متن حدیث کی پرکھ کے لئے آٹھ اور اسناد کے لئے چار علامتیں مقرر کی گئی ہیں۔[۱]

اصل بات یہ ہے کہ نقد و جرح میں یہ فرط احتیاط اور شدت حزم مؤلف فجر الاسلام کو پسند نہیں آئی۔ کیونکہ ان کے مستشرق استاتذہ کو بھی یہ چیز ناپسند تھی چنانچہ اسی باعث انھوں نے مذکورہ بالا تنقید فرمائی۔ موصوف کے خیال میں محدثین کو نقد حدیث میں درج ذیل امور کی تحقیق کرنا چاہئے تھا۔

۱۔ کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اقوال ان حالات و ظروف سے مطابقت رکھتے ہیں۔ جن میں وہ کہے گئے۔؟

۲۔ کیا تاریخی واقعات ان کی تائید کرتے ہیں۔؟

۳۔ کیا وہ حدیث رسول اللہؐ کے مزاج و طبیعت کے خلاف ایک قسم کی فلسفیانہ تعبیر ہے۔؟

۴۔ کیا حدیث اپنے شرائط و قیود کے باعث متون فقہ سے زیادہ مشابہ ہے۔؟

اب ہم ذیل میں ڈاکٹر احمد امین کے وضع کردہ نقد حدیث کے "جدید قواعد" پر بالترتیب تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔

۱۔ مؤلف فجر الاسلام کا یہ خیال صریحاً غلط ہے کہ "محدثین نے اس بات کی تحقیق نہیں کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ۔ ۔ ۔ حدیثیں اپنے زمانے کے حالات سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں"۔ اس لئے کہ علمائے حدیث نے اس عیب کو متن حدیث میں وضع حدیث کی علامات میں شمار کیا ہے۔ اس کی مثال میں یہ حدیث پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذؓ کی

---

[۱] الباعث الحثیث ص ۹، المنار لابن قیم ص ۱۲۰، تدریب الراوی ص ۱۸۰

نوٹ:۔ ان کتابوں سے یہ علامات مستنبط ہیں۔

شہادت اور حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان کے خط کی بنیاد پر اہل خیبر پر جزیہ مقرر کرکے انھیں بیگاری کی مشقت وصعوبت سے نجات دلادی تھی۔ حالانکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ عام خیبر تک نہ تو جزیہ کی مشروعیت ہوئی تھی اور نہ یہ معروف عام ہی تھا۔ بلکہ آیت جزیہ کا نزول تو عام تبوک کے بعد ہوا ہے۔ پھر حضرت سعدؓ بن معاذ اس سے قبل ہی غزوۂ خندق میں راہی ملک بقا ہو گئے تھے۔ اور حضرت امیر معاویہؓ فتح مکہ کے موقع پر مشرف باسلام ہوئے۔[1] اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تاریخی حقائق مذکورہ حدیث کی تردید کرتے ہیں اور اس کو موضوع قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح کی ایک اور مثال حضرت انسؓ سے مروی یہ حدیث ہے کہ "میں غسل خانے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہاں رسول اللہؐ تہبند باندھے بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے آپ سے بات کرنی چاہی تو ارشاد فرمایا، اے انس! اسی وجہ سے میرے لیے غسل خانے میں بغیر تہبند باندھے داخل ہونا حرام ہے۔" حالانکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی غسل خانے میں نہیں گئے۔ اور نہ اس زمانے تک غسل خانے معروف ہی تھے۔

۲۔ اگر تاریخی مسلمات وحقائق کسی حدیث کے مؤید نہیں ہیں تو محدثین نے اسے بھی علامات وضع میں شمار کیا ہے۔ اور اس کی مثال اہل خیبر پر جزیہ مقرر کرنے کے بارے میں مذکورۃ الصدر حدیث ہے۔ علمائے جرح نے اسی بنیاد پر اس حدیث کو ناقابل قبول قرار دیا ہے کہ تاریخی حقائق اس کے خلاف ہیں۔ ایسی صورت میں احمد امین کی یہ رائے قطعی لاعلمی پر مبنی ہے کہ محدثین نے نقد حدیث کے وقت اس اصول کو مدنظر نہیں رکھا ہے کہ حوادث زمانہ اور تاریخی حقائق حدیث زیر بحث کی تائید کرتے ہیں یا تکذیب۔

---

[1] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۰، المنار لابن قیم ص ۳۰-۳۰۸، تذکرۃ الحفاظ للذہبی ص ۱۱۴۱۔

۳۔ نقد حدیث کے لیے احمد امین کا وضع کردہ یہ اصول بھی اپنے اندر کوئی جدت وندرت نہیں رکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معروف انداز تکلم کے خلاف ملنے والی بعض احادیث کو محض ایک فلسفیانہ تعبیر پر محمول کیا جانا چاہئے۔ کیونکہ ہمارے علمائے جرح وتعدیل نے اس اصول پر "رکاکت لفظ" کے تحت بحث کی ہے۔ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ رسول اکرمؐ سے اس طرح کے کلام کے صدور کی مکمل نفی کردی جائے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کی رائے ہے کہ "رکاکت (یعنی بھد پن) میں اصل معنی کی رکاکت ہے۔" چنانچہ جس حدیث میں اس کا وجود ہوگا وہ بلاشبہ موضوع قرار دی جائے گی۔ خواہ اس میں لفظی گھٹیا پن نہ ہو۔ اس لیے کہ پورا دین مجموعۂ محاسن وفضائل ہے اس میں کسی طرح کی پستی اور گھٹیا پن دین کے بنیادی مزاج کے خلاف ہے۔ اور اگر کسی حدیث میں صرف لفظی رکاکت ملتی ہے تو یہ اس کے موضوع قرار دینے کے لیے کافی نہیں کیونکہ اس بات کا احتمال موجود ہے کہ راوی نے روایت بالمعنی کرکے اصل الفاظ حدیث تبدیل کردیئے ہوں۔[1]

۴۔ اب رہی یہ بات کہ احادیث اپنے شرائط وقیود کے باعث فقہی متون سے زیادہ مماثلت رکھتی ہیں۔ تو محدثین نے کسی حدیث کی صحت کے لئے اس بات کو شرط قرار دیا ہے کہ وہ اس کے متعصب راوی کے ذاتی مسلک کی آئینہ دار نہ ہو۔ اسی باعث فقہ وعقائد کے باب میں بکثرت احادیث کو رد کردیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ رواۃ کے شخصی مذاہب کی مؤید تھیں۔ مثلاً یہ حدیث کہ جنبی (جس پر غسل واجب ہو) کے لیے تین تین بار کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا فرض ہے۔[2] یا یہ حدیث کہ اگر کسی کپڑے میں ایک درہم کے برابر خون لگا ہو تو کپڑا دھو کر نماز کا اعادہ

---

[1] الباعث الحثیث ص ۹۰۔ [2] تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ ص ۶، ج ۲ (امام بزار کا قول ہے کہ اس حدیث کی نکارت پر علماء کا اتفاق ہے)

کر لیا جائے۔[۱] ابن الجوزی کا قول ہے کہ اس حدیث کی سند میں بکثرت مجہول رواۃ شامل ہیں۔ غرض اس طرح کی احادیث کو ماہرین فن نے یکسر موضوع قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر احمد امین کی اس رائے سے قطعی اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ "امام بخاری اپنی تمام تر علوئے مرتبت اور دقتِ نظری کے باوصف ایسی احادیث نقل کرتے ہیں جنکی عدم صحت پر حقائق روزگار اور تجربات و مشاہدات شاہد ہیں"۔ اس سلسلہ میں موصوف نے جن دو حدیثوں سے استدلال کیا ہے وہ بجائے خود ان کی رائے کی معارض ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "لا یبقی علی ظہر الارض بعد مائۃ سنۃ نفس منفوسۃ" والی حدیث صحیح ہے۔ امام بخاری کے علاوہ امام ابو داؤد اور ترمذی نے بھی اس کی تخریج کی ہے۔ نیز یہ حدیث مختلف طرق سے مروی ہے۔ اس کا منشا و مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی بیان کرنا ہے کہ سو سال گزر جانے کے بعد عہد نبوت کا کوئی شخص روئے زمین پر زندہ باقی نہ رہے گا۔ درحقیقت یہ پیشگوئی علامات نبوت میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ عہد رسالت کی فصل بہار سو سال سے زیادہ باقی نہیں رہی، اور دیدار نبویؐ سے مشرف ہونے والی ایک ایک دیدۂ روشن اس عرصہ میں ابدی نیند سو گئی۔

مذکورہ حدیث کا ماحصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرامؓ پر یہ حقیقت منکشف کرنا ہے کہ ان کو امم سابقہ کی طرح طویل عمریں نصیب نہیں ہونگی۔[۲] اس لیے انھیں اس مختصر عرصہ حیات کو غنیمت جان کر عبادت و طاعت اور توشۂ آخرت کی تیاری میں بیش از بیش ریاضت کرنی چاہیے۔ حدیث بالا میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے، جسے حقائق زمانہ اور عام تجربہ و مشاہدہ کے خلاف

---

[۱] تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ ج ۲ ص ۶۷۔

[۲] تاویل مختلف الحدیث لابن قتیبہ ص ۱۱۹۔

کہا جا سکے۔ چنانچہ ڈاکٹر مصطفی سباعی رقمطراز ہیں کہ "فی الواقع جو حدیث رسول اللہؐ کے اہم معجزات میں شمار کئے جانے کے لائق ہے وہ مؤلف فجر الاسلام کی نقد جدید کی منطق کے مطابق محض کذب و افترا قرار پاتی ہے"۔[۱]

اسی طرح دوسری حدیث "من اصطبح کل یوم سبع تمرات لم یضرہ سم ولا سحر ذلک الیوم والی اللیل"، کی تخریج امام بخاری نے کتاب الطب میں کی ہے۔[۲] مزید برآں امام مسلم اور امام احمد نے بھی اپنی کتابوں میں اسے نقل کیا ہے۔[۳] اس حدیث کی شرح بعض علماء نے دوسری مفید احادیث کی روشنی میں کی ہے۔ اور اسے کھجور مدینہ کے ساتھ مختص کیا ہے۔ اور بعض نے اسے مطلق رکھا ہے۔ لیکن اکثر محدثین کے نزدیک یہ حدیث مدینہ کی عجوۃ کھجوروں کے ساتھ خاص ہے۔ ابن قیم کا بیان ہے کہ "مدینہ کی عجوہ کھجور حجاز کی ہر نوع کی کھجوروں میں سب سے زیادہ مفید اور نفع بخش ہے۔ اور ویسے بھی کھجور اپنی گرم و تر تاثیر اور غذائیت کے اعتبار سے تمام پھلوں پر فائق ہے۔ صبح نہار منہ کھانے سے اس کی تریاقی طاقت منہ کے کیڑوں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص پابندی کے ساتھ نہار منہ کھجور کھایا کرے تو اس کے منہ میں کیڑوں کا مادہ خشک یا بالکل ختم ہو جائے گا۔

نہایت تعجب و حیرت کا مقام ہے کہ اگر بقراط و جالینوس وغیرہ کسی خاص خطہ کی کھجور ایک مخصوص مقدار میں کھانے کی یہی خصوصیات بیان کرتے تو دنیا کے تمام اطباء پورے یقین و اعتماد کے ساتھ اس فارمولے کو ہاتھوں ہاتھ لیتے، حالانکہ حکمائے عالم کا بیان صرف ظن و تخمین کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر جب صاحب وحی نے پورے اذعان و یقین اور قطعیت کے ساتھ کھجور کے خواص بیان کئے تو اسے قبول

---

[۱] السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی ص ۲۶۱ [۲] البخاری ج ، ص ۲۰ [۳] صحیح مسلم ج ۳ ص ۱۶۱۸، ۱۶۱۹، مسند احمد بن حنبل ج ۲ حدیث ۳۴۴۲، ۱۰۹۲۰، ۱۵۰۱۱، ۱۵۰۱۱ [۴] فتح الباری ج ۱۰ ص ۲۴۰۔

کرنے کے بجائے اس پر "تجربہ و مشاہدہ" کے خلاف ہونے کا اعتراض وارد کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی" میں احمد امین کے تمام شبہات و اعتراضات کا نہایت مدلل طور پر علمی رد کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کتاب مذکور کے صفحات ۲۰۳ تا ۲۱۲ کا مطالعہ نہایت افادیت کا حامل ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر احمد امین "فجر الاسلام" کے صفحہ ۲۹ ۵ پر وضعیت حدیث کے آغاز و ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"وضعیت کی حد و مقدار جاننے کے لیے اتنی دلیل کافی ہے کہ امام احمد بن حنبل کے نزدیک احادیث تفسیر میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔ اس باب میں ہزاروں حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ صرف صحیح بخاری سات ہزار صحیح احادیث تفسیر پر مشتمل ہے جن میں سے تین ہزار مکررات ہیں۔ محدثین کا بیان ہے کہ امام بخاری نے ان حدیثوں کو اپنے عہد میں متداول چھ لاکھ احادیث کے ذخیرہ سے منتخب کیا ہے۔"

ظاہر ہے مذکورہ بالا خیال آرائی کا حاصل وضع حدیث کی کثرت ظاہر کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف نے احادیث تفسیر اور احادیث بخاری کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ حدیث کے اکثر مجموعوں میں تفسیر کے مستقل ابواب ملتے ہیں جن کے تحت بلا غبار صحیح احادیث درج ہیں۔ علمائے فن نے مفسر قرآن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول تفسیر پر اعتماد کرنا لازمی قرار دیا ہے۔ چنانچہ امام ابوجعفر طبری رقمطراز ہیں۔

"اللہ جل شانہ نے قرآن پاک اپنے نبی پر نازل کیا ہے۔ اسلئے اس کی تفسیر و تشریح تک رسائی بھی رسول اکرم ہی کے بیانات و

اقوال کی روشنی میں ہو سکتی ہے[1]"

امام ابوحیان اندلسی اپنی تفسیر میں خامہ ریز ہیں۔

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث ہی سے قرآن کے مبہم معانی کی تعیین، اجمال کی وضاحت، اسبابِ نزول و نسخ آیات کی معرفت ہو سکتی ہے۔ اور حدیث کی تمام امہات کتب مثلاً صحیحین۔ سنن ترمذی، اور سنن ابی داؤد وغیرہ میں اس باب کی احادیث کثرت سے ملتی ہیں[2]"

حافظ جلال الدین سیوطی نے "اتقان" میں ابن تیمیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے سامنے قرآن پاک کے الفاظ و معانی دونوں کی تفسیر و تشریح فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی "لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ" دونوں طرح کی تفسیروں کو شامل ہے۔ امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم بیان فرمایا اس کو قرآن مجید سے مستنبط کر کے فرمایا ہے[3]" مزید برآں علامہ زرکشی نے تفسیر قرآنی کی دو قسمیں ذکر کی ہیں۔ ایک وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام اور تابعین سے منقول ہے۔ اور دوسری قسم تفسیر غیر منقول ہے۔ علمائے تفسیر نے منقول سے رجوع کرنا واجب قرار دیا ہے۔ اگر احمد امین کے زعم کے مطابق احادیث تفسیر غیر صحیح ہوتیں تو علماء ایسا اہم حکم نہ دیتے۔ بلکہ بعض ماہرین فن کے نزدیک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول تفسیر کے علاوہ کوئی اور تفسیر کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ علامہ سیوطیؒ رقمطراز ہیں۔

---

[1] تفسیر الطبری ج ۱ ص ۲۵۔ [2] البحر المحیط ج ۱ ص ۶۔

[3] مقدمہ تفسیر ابن تیمیہ

"کیا قرآن کے معانی میں ہر شخص غور و فکر کر سکتا ہے؟ اس بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ایک طبقہ کا خیال ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا بڑا عالم اور ادیب ہو اور منطق، فقہ، نحو اور تاریخ وغیرہ علوم پر اس کی نظر کتنی ہی وسیع ہو۔ اس کے لیے رسول اکرمؐ سے مروی تفسیر کے علاوہ قرآن کی کوئی اور تفسیر کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔" (الاتقان ۱۷-۱۸)

یہ رائے انتہا پسندانہ اور غیر معمول بہ سہی مگر اس سے اتنا بہر حال ثابت ہوتا ہے کہ احادیث تفسیر سے تجاہل برتنا یا ان کا انکار کرنا کسی کے لیے درست نہیں ہے۔

ڈاکٹر احمد امین نے اپنے مذکورہ اقتباس میں امام احمد بن حنبلؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "تین چیزوں کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ تفسیر[۱]، ملاحم[۲]، مغازی[۳]۔" اس پر درج ذیل چند اعتبارات سے بحث کی جا سکتی ہے۔

۱۔ خود امام احمدؒ نے اپنی مسند میں مغازی، تفسیر اور ملاحم کے بارے میں کثرت سے احادیث ذکر کی ہیں۔ ان کا یہ عمل خود ان کے مذکورہ قول کے متناقض ہے۔

۲۔ کسی چیز کے صحیح ہونے کی نفی کر دینے سے اس کا ضعیف اور موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔ ملا علی قاری نے تذکرۃ الموضوعات میں لکھا ہے کہ

لا یلزم من عدم الثبوت	کسی بات کا عدم ثبوت اس کے
وجود الوضع	موضوع ہونے کو مستلزم نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی۔ "تخریج الاذکار المسمی بنتائج الافکار" میں امام احمدؒ بن حنبل کا یہ قول نقل کر کے کہ "لا اعلم فی الوضوء حدیثاً ثابتاً" (یعنی وضوء کے بارے میں مجھے کسی صحیح حدیث کا علم نہیں)، لکھتے ہیں کہ "میری رائے میں کسی چیز کی

عدم واقفیت سے اس کا معدوم ہونا ثابت نہیں ہوتا[۱]"

۳۔ امام احمدؒ نے یہ نہیں فرمایا کہ تفسیر کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہ کہا کہ تین چیزوں کی کوئی اصل و حقیقت نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے اس کا مقصد شاید ذکر کرنا ہے کہ مذکورہ تینوں علوم میں مستقل و مخصوص کتابیں نہیں ہیں۔ ایک دوسری روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ثلاثۃ کتب لا اصل لہا المغازی والملاحم والتفسیر۔

۴۔ امام احمد کے مذکورۂ بالا قول سے اس بات کا بھی قوی احتمال ہے کہ مذکورہ علوم ثلاثہ کے بارے میں صحیح احادیث غیر صحیح کی بہ نسبت کم ہیں۔ اکثر اہل علم نے ابن حنبلؒ کے مذکرہ قول کو اسی معنیٰ پر محمول کیا ہے۔ امام زرکشی "البرہان" میں رقمطراز ہیں کہ:۔

مرادہ ان الغالب لیس لہا	اس کی مراد یہ ہے کہ بیشتر احادیث
اسانید صحاح متصلۃ	صحیح متصل سند سے مروی نہیں ہیں۔
والا صح من ذٰلک کثیر[۱]	ورنہ اس میں صحیح حدیثیں کافی ہیں۔

ڈاکٹر احمد امین نے اس بات پر بڑے تعجب و حیرت کا اظہار کیا ہے کہ امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث کے ذخیرہ سے کس طرح صحیح احادیث کا انتخاب کیا ہوگا۔ اور پھر اس استغراب سے انھوں نے احادیث بخاری میں وضعیت کی کثرت پر استدلال کیا ہے۔ بلاشبہ امام بخاریؒ کے عہد میں متداول احادیث کی تعداد کیف و کم کے احاطہ سے باہر تھی۔ چنانچہ دستیاب کتب حدیث میں روایات کی کثرت و صحت دیکھکر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام احمدؒ بن حنبل

---

[۱] الرفع والتکمیل ص ۸۷

[۲] السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی ص ۱۸۳-۱۸۴

کو سات لاکھ سے زیادہ حدیثیں یاد تھیں، اسی طرح کا ایک قول ابو زرعہ سے بھی منقول ہے۔ امام بخاریؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دو لاکھ ضعیف اور ایک لاکھ صحیح احادیث کے حافظ تھے، امام مسلم کا بیان ہے کہ

جمعت کتابی ھذا من ثلاث مائۃ الف حدیث

میں نے تین لاکھ احادیث میں سے انتخاب کر کے اپنی کتاب مرتب کی ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ عام لوگوں کا ذکر نہیں بہت سے تعلیم یافتہ لوگ بھی اس بات سے ناواقف ہیں کہ احادیث کی یہ غیر معمولی تعداد دراصل متابعات وشواہد کی کثرت کا نتیجہ ہے۔ مثلاً حدیث "انما الاعمال بالنیات" سات سو طرق سے مروی ہے۔ چنانچہ احادیث کے مجموعوں سے اگر ان متابعات وشواہد کو نکال دیا جائے تو احادیث کی بہت تھوڑی سی تعداد باقی رہ جاتی ہے۔ اسی باعث صحیح بخاری میں روایات صحیحہ کی کل تعداد دو ہزار چھ سو دو (۲۶۰۲) اور صحیح مسلم میں چار ہزار ہے۔ اس طرح کتب حدیث میں مروی احادیث کی کل تعداد پچاس ہزار (۴۰۰۰۰) ہے۔ اور اس میں بھی صحیح، سقیم، متفق علیہ اور متکلم فیہ غرض تمام نوعیت کی حدیثیں شامل ہیں۔ امام ابو حاکم نیشاپوری نے (جو حدیث قبول کرنے کے معاملہ میں ذرا متساہل واقع ہوئے ہیں) صراحت کی ہے کہ اول درجہ کی احادیث دس ہزار سے زیادہ نہیں ہیں۔[1]

مؤلف فجر الاسلام کا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی جامع صحیح میں تمام روایات صحیحہ کا استقصا کیا ہے۔ بلکہ یہ ایک معروف عام حقیقت ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں ہر صحیح حدیث کا استیعاب نہیں کیا ہے۔ چنانچہ خود امام صاحب سے منقول ہے کہ

لم اخرج فی ھذا الکتاب

میں نے اس کتاب میں صرف صحیح

---

[1] توجیہ النظر ص ۹۳

إلا صحیحا وما ترکت فی الصحیح اکثر[1]

احادیث کی تخریج کی ہے۔ اور اس میں بھی بہت سی حدیثیں چھوڑ دی ہیں۔

حافظ حازمی رقمطراز ہیں۔

اما البخاری فلم یلتزم ان یخرج کل ما صح عندہ من الحدیث[2]

امام بخاریؒ نے ہر صحیح حدیث کی تخریج کا التزام نہیں کیا ہے۔

فواد سزگین کی آراء کا نقد

ہم عصر علماء میں "تاریخ التراث العربی" کے مشہور مصنف استاد فواد سزگین نے بھی مستشرقین کے افکار و نظریات سے گہرا اثر قبول کیا ہے، اور ان کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی کاوش کی ہے، موصوف نے بروکلمان کی شہرۂ آفاق کتاب "تاریخ الادب العربی" کو جدید ذوق و معیار کے مطابق ایڈٹ کیا ہے، اس میں بعض نہایت گرانقدر اضافے (مثلاً ہر مصنف کی تمام مطبوعہ و مخطوطہ تصانیف کی نشاندہی وغیرہ) کیے ہیں جن کے باعث یہ کتاب ہر عالم و محقق کا مرجع بن گئی ہے، بلاشبہ اس عظیم علمی کارنامے پر فواد سزگین ہر سپاس و تحسین کا مستحق ہیں۔ مگر بایں ہمہ جہاں انھوں نے صحیح بخاری کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے، اس سے مستشرقین کے نظریات کی تراوش ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہیں

"سب سے بڑی غلطی جس کے نتیجہ میں دوسری غلطیوں کا صدور ہوتا گیا۔ یہ ہوئی کہ صحیح بخاری کو پہلی "مصنف" خیال کر لیا گیا جو ہر فقہی مسئلہ اور ہر فقہی باب میں قندیلِ راہ کی خدمت انجام دینے کے لئے تالیف کی گئی ہے۔"

---

[1] تدریب الراوی ص ۴۸، و فتح المغیث ج ۱ ص ۱۱، [2] شروط الائمۃ الخمسۃ ص ۴۴

"میں نے علم حدیث کے ارتقا کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ امام بخاریؒ اور ان کے معاصرین کے مجموعہ ہائے حدیث کسی طرح بھی کتب "مصنف" کی نمائندگی نہیں کرتے اس لئے کہ وہ محض سو سال کی مدت میں تالیف ہونے والے مختلف "مصنفات" کا مجموعہ و ملخص ہیں۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی جامع میں بغیر تحقیق و تنقیح کے بکثرت لغوی، تاریخی، فقہی اور حدیث کی کتب سے استفادہ کیا ہے۔" (تاریخ التراث العربی ج ۲ ص ۱۷۳)

صحیح بخاری کے بارے میں استاذ فواد سزگین کی اس غلط رائے پر سخت تعجب و حیرت ہوتی ہے اس لیے کہ کسی بھی مسلمان اہل علم نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ امام بخاری کی جامع صحیح علم حدیث کی پہلی "مصنف" ہے۔ بلکہ صرف یہ ذکر کیا ہے کہ احادیث صحیحہ کے باب میں پہلی تصنیف کی حیثیت سے اس کی اہمیت مسلم ہے۔ چنانچہ امام نوویؒ "التقریب" میں رقمطراز ہیں:۔

اوّل مصنف فی الحدیث المجرد صحیح البخاری ثم مسلم وھما أصح الکتب بعد القرآن العزیز والبخاری أصحھما[1]

صحیح بخاری احادیث صحیحہ کی پہلی تصنیف ہے اس کے بعد مسلم کا درجہ ہے۔ اور یہی دونوں قرآن کے بعد اصح الکتب ہیں۔ ان دونوں میں بھی صحیح بخاری کا پایہ صحت کے اعتبار سے زیادہ بلند ہے۔

بلاشبہ امام بخاری سے پہلے کتب حدیث موجود تھیں لیکن صورت حال

---

[1] راقم نے اپنی عربی کتاب "الامام البخاری" میں اس طرح کے متعدد اقوال جمع کر دئے ہیں۔

یہ تھی کہ ان کتابوں میں صحیح و سقیم روایات خلط ملط تھیں اور کسی حدیث کے درجۂ صحت کا تعین رجال و رواۃ کی جانکاہ تحقیق کے بعد ہی ممکن ہو سکتا تھا اگر پھر بھی اس بارے میں کوئی واضح رہنمائی نہیں ملتی تھی تو ائمۂ حدیث سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ اور بالفرض اگر یہ بھی ممکن نہ ہوتا تو وہ حدیث تا وقت مجہول الحال ہی باقی رہ جاتی تھی لیکن جب امام بخاری نے علم حدیث کے فلک رفعت ایوان پر اپنی سطوت و علوئے مرتبت کے علم بلند کیے تو انھوں نے نہایت کاوش و محنت کے ساتھ صحیح روایات منتخب کر کے اپنی شہرۂ آفاق "جامع صحیح" تالیف کی تاکہ علم حدیث کا لذت شناس تلاش و تحقیق کی بے جا زحمت سے نجات پا جائے۔ امام بخاریؒ نے اس میں صرف وہی احادیث درج کی ہیں۔ جنکی صحت ان کے نزدیک مسلم تھی، اس کتاب کا پورا نام انھوں نے "الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ" رکھا۔ اس لیے علمائے امت کا اجماع ہے کہ صحیح بخاری نہ صرف تمام مجموعہ ہائے حدیث میں افضل ہے۔ بلکہ قرآن کے بعد اسے اصح الکتب کی حیثیت حاصل ہے۔ امام قسطلانی بڑے ادیبانہ انداز میں رقمطراز ہیں۔

"صحیح بخاری علم حدیث کی سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے اس نے ہر عہد کے علماء سے قبول عام کی سند حاصل کی ہے۔ اپنی گوناگوں خصوصیات و محاسن میں وہ تمام علوم و فنون کی ہم عصر کتب میں فائق و ممتاز ہے۔ تمام اکابر اہل علم اور فضلائے روزگار نے اسکی عظمت کا اعتراف کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کے فضائل و محاسن کیف و کم کے احاطہ سے باہر ہیں۔"

اب رہی یہ بات کہ "صحیح بخاری کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہر فقہی باب اور ہر فقہی مسئلہ کے لئے شمع راہ ثابت ہو" تو یہ "نئی تحقیق" ہمارے علمی حلقوں میں قطعاً غیر معروف ہے۔ ہر اہل علم جانتا ہے کہ امام بخاری نے جامع صحیح صرف اس لیے تالیف کی کہ صحیح احادیث کا اہتمام کیا جائے۔ اور اس کے متون سے بیش از بیش معانی و مفاہیم کا استخراج کیا جائے۔ چنانچہ اسی لئے انھوں نے مختلف ابواب میں مکرر احادیث درج کی ہیں۔ بلکہ بعض احادیث کو بیس[1] مرتبہ سے بھی زیادہ ذکر کیا ہے۔ اسی باعث علماء کا یہ مشہور قول زبان زد خلائق ہے کہ "فقہ البخاری فی تراجمہ"[2] حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں۔

"یہ بات طے شدہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب میں صحت کا التزام رکھا ہے۔ اور صرف روایات صحیحہ ہی درج کی ہیں۔ یہی اس کا اصل موضوع بھی ہے۔ جو اس کتاب کے مکمل نام "الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ" سے بھی ظاہر ہے۔ پھر اس کے بعد امام صاحب کی رائے ہوئی کہ وہ فوائد فقہیہ اور نکات فلسفیانہ سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اس لیے انھوں نے اپنی بصیرت کے مطابق متون حدیث سے بکثرت مسائل کا استخراج کیا۔ اور کتاب کے تمام ابواب میں حسن تناسب سے انھیں پھیلا دیا"[3]

معلوم ہوا کہ فواد سزگین کی یہ رائے کہ "صحیح بخاری کا مقصد تالیف ہر فقہی مسئلہ کی وضاحت یا تمام ابواب فقہیہ کا ذکر تھا" صحیح نہیں ہے۔

اسی طرح یہ بات کہ "امام بخاری نے کتب حدیث کے علاوہ بکثرت لغوی،

---

[1] مقدمہ لامع الدراری علی البخاری ص ۲۰۵ [2] مقدمہ فتح الباری ص ۱۵۔

تاریخی اور فقہی کتب سے بغیر کسی تحقیق و تنقیح کے استفادہ کیا ہے" صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے۔ جس کا صحیح بخاری اور اس کے مصنف کی غایت احتیاط و جستجو کے بارے میں کوئی مطالعہ نہ ہو۔ خود امام بخاری کے درج ذیل بیانات اس کے شاہد عدل ہیں۔

"میں نے اپنی کتاب میں کوئی حدیث درج کرنے سے پہلے غسل کیا۔ اور دوگانہ نفل ادا کیا ہے۔"

"میں نے اپنی جامع صحیح چھ لاکھ احادیث میں سے انتخاب کر کے ۱۶ سال میں تالیف کی ہے۔ نیز میں نے اسے اپنے اور اللہ کے درمیان حجت بنایا ہے۔"

"میں نے اپنی کتاب میں کوئی حدیث درج کرنے سے پہلے استخارہ کیا اور دوگانہ نفل ادا کیا ہے۔ نیز اس حدیث کی صحت کا تیقن کر لیا ہے۔"[1]

پھر قابل ذکر بات یہ ہے کہ امام بخاری نے احادیث کے مواج سمندر میں سے صرف دو ہزار چھ سو دو (۲۶۰۲) موتی چن کر جمع کیے ہیں۔ کیا اس شدت حزم و احتیاط کی نظیر مل سکتی ہے۔؟ علاوہ ازیں امام بخاری نے صحت حدیث کے جن سخت ترین شرائط و قیود کا پورا التزام کیا ہے۔ وہ اعتبار و اعتماد اور صحت و ثبوت کا منتہائے کمال ہے۔ دوسرے مولفین حدیث کے یہاں اس کی مثال مفقود ہے۔[2] یہ صحیح ہے کہ امام بخاری نے بہت سے تاریخی، لغوی اور فقہی مراجع پر اعتماد اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ مگر اس میں بھی انھوں نے اپنی مجتہدانہ شان برقرار رکھی ہے۔ ان کی بعض اجتہادی آراء سے اختلاف رائے

---

[1] مقدمہ لامع الدراری ص ۱۲۲ [2] شروط الائمۃ الستۃ للمقدسی ص ۴۷ نیز ملاحظہ ہو مقالہ نگار کی کتاب البخاری ص ۱۲۰

ممکن ہے۔ مگر عدم تحقیق و تنقیح کا تصور بھی محال ہے۔

استاذ فواد سزگین مزید رقمطراز ہیں۔

"اسانید کے اعتبار سے صحیح بخاری درجہ کمال کو نہیں پہونچتی ہے۔ چنانچہ تقریباً ربع کتاب کی اسانید ناقص ہیں چوتھی صدی کے آغاز میں اس عمل کو تعلیق کا نام دیا گیا۔ اس بناپر صحیح بخاری جمع و ترتیب اور اپنے مشمولات میں معروف شہرت سے محروم ہو جاتی ہے۔ خود امام بخاری کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ وہ ایسے عالم حدیث نہ تھے۔ جنھوں نے اسناد کو درجۂ کمال تک پہونچایا۔ بلکہ وہ پہلے شخص ہیں جن سے اسناد کا انحطاط شروع ہوا[1]

.... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسناد کی مکمل حقیقت سے امام بخاری واقف ہی نہ تھے۔ اور ان کے یہاں اسناد اپنا اعلیٰ مقام و مرتبہ کھو بیٹھتی ہے"[2]

فواد سزگین نے اپنی مذکورۃ الصدر تصنیف میں ایک مستقل باب علم حدیث کے مقدمہ کے طور پر سپرد قلم کیا ہے۔ جو تیس صفحات پر محیط ہے۔ اس میں موصوف نے علم حدیث کی کتابت و تدوین اور روایات کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور بلاشبہ انھوں نے بکثرت مفید معلومات کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن بایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ حدیث و مصطلحات کی کتابوں کے بارے میں فواد سزگین کا مطالعہ صفر کے برابر ہے۔ انھوں نے خود مستشرقین کے افکار کو بغیر کسی تحقیق و تنقید کے قبول کر لیا ہے۔ اور امام بخاری و جامع صحیح کو اس کے بلند مقام سے گرانے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ سطور بالا میں

---

[1] تاریخ التراث العربی ج ۲ ص ۱۷۱ [2] ایضاً ص ۱۱۴۔

ذکر آچکا ہے کہ امام بخاری نے صحتِ حدیث کے سخت ترین شرائط کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ امام صاحب کے یہاں راوی اور مروی عنہ میں ملاقات ہونا شرط ہے۔ جب کہ امام مسلم کے یہاں دونوں میں معاصرت ہی کافی ہے۔

امام حازمی کا قول ہے کہ:" دراصل امام بخاری حدیث میں ایک مختصر کتاب تالیف کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد حدیث و رجال کا استیعاب کرنا نہیں تھا۔ بس ان کی واحد شرط یہ رہی ہے کہ صحیح احادیث ہی کی تخریج کریں[1]"۔ اسی بناپر شناوران علم حدیث اور ماہرین اسماء الرجال نے دوسری کتب اسماء رجال کی بہ نسبت بخاری و مسلم پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ صحیح بخاری میں جس راوی سے کسی حدیث کی تخریج کی گئی ہے اس کے بارے میں شیخ ابوالحسن مقدسی کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ "ھذا جاز القنطرۃ" (یعنی یہ شخص پل پار کر گیا) مطلب یہ کہ اس راوی کے بارے میں کسی طرح کی نقد و جرح ناقابل اعتنا ہے[2]۔

خلاصہ کلام یہ کہ امام بخاری نے کسی حدیث کو قبول کرنے سے پہلے تحقیق و جستجو میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی ہے۔ مستشرقین کے اتباع میں ڈاکٹر فواد سزگین کے متذکرہ بالا افکار و نظریات تعجب انگیز ہیں۔ کیونکہ انھوں نے علم حدیث کی تاریخ لکھنے اور کتب حدیث و رجال کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے اپنی کتاب میں مستقل ایک فصل قائم کی ہے۔ اور ...... تقریباً تیس صفحے تحریر کر ڈالے ہیں، انھوں نے گر ایسا عدم واقفیت کی بنا پر کیا ہے تو حق کی طرف رجوع واجب ہے۔ اور اگر عمداً ایسا کیا ہے تو ظاہر ہے اس کا مقصد حدیث کی بنیاد کو مکمل طور پر تباہ کرنا ہے۔ سردست

---

[1] مقدمہ لامع الدراری ص ۹۴ [2] مقدمہ فتح الباری۔ ص ۳۶۹

راقم سطور مذکورہ بالا گزارشات ہی پر اکتفا کرتا ہے۔ ورنہ ہمارے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ میں احمد امین اور فواد سزگین جیسی مثالوں کی کمی نہیں ہے۔ دراصل عصر حاضر میں یہ موضوع بے حد اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔

واللہ من وراء القصد وھو ولی التوفیق۔